مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

(۳)

سعید احمد اکبر آبادی

دور جدید کے اردو شعراء میں حسرت موہانی مفتی صاحب کو سب سے زیادہ پسند تھے، وہ ان کے بڑے مداح اور معترف تھے، ان کی غزلوں کی غزلیں مفتی صاحب کو یاد تھیں، حسرت کی ایک غزل جس کے دو شعر یہ ہیں:

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں!

بے زبانی ــ ترجمانِ شوقِ بیحد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں!

ایک اور غزل ہے جس کے یہ دو شعر اب تک مجھے یاد ہیں:

دامنوں کی نہ خبر ہے نہ گریبانوں کی
قابل دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی

اے جفا کار ترے عہد سے پہلے تو نہ تھی
کثرت اس درجہ محبت کے پشیمانوں کی

مفتی صاحب کو حسرت کی یہ دو غزلیں بہت پسند تھیں، بہانہ بہانہ سے

انھوں نے ان کو اتنی بار پڑھا کہ سنتے سنتے مجھے بھی یاد ہوگئی تھیں، ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کیا: تمھیں حسرت کا کونسا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟ میں نے کہا یہ شعر:

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

بولے: اوہو ہو! کیا غضب کی داخلیت ہے۔

حسرت سے مفتی صاحب کی ملاقات بھی عجب ڈرامائی انداز میں ہوئی، ایک مرتبہ مفتی صاحب نے بیان کیا: تحریک خلافت شباب پر تھی، اس کی ایک کانفرنس کراچی میں تھی، اس میں شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند سے میں اور چند ساتھی کراچی کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں صبح کے وقت ہم بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ہمارے سروں پر اوپر کی برتھ پر ایک صاحب تشریف فرما ہیں جو فربہ اندام اور پست قامت ہیں، رنگ سانولا، چہرہ پر چیچک کے نشان، ڈاڑھی گنجان، آنکھیں درخشاں اور بڑی، پیشانی فراخ اور کشادہ، نہایت موٹے کھدر کی شیروانی اور پاجامہ، سر پر میلی کچیلی ترکی ٹوپی، عمر چالیس پچاس کے درمیان، اب ہم لوگوں کی ان بزرگوار پر اچانک نظر پڑی تو ان سے دلچسپی پیدا ہوگئی، سوال یہ تھا کہ یہ ہیں کون بزرگوار؟ جتنے منہ اتنی باتیں، کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ، میں نے کہا: یہ بزرگوار کوئی بھی ہوں مگر ہیں کوئی بڑے آدمی ضرور! اتنے میں ایک بڑا اسٹیشن آگیا اور ہم نے ایک مکلف ناشتہ کا آرڈر دیا، ناشتہ آگیا تو ہم نے ان صاحب سے کہا: آیئے جناب ناشتہ کر لیجئے، وہ فوراً پھدک کر نیچے تشریف لے آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے، اب گفتگو شروع ہوئی:

ہم: جناب کہاں جا رہے ہیں؟

وہ: (خنخناتی آواز میں) جی! میں کراچی جا رہا ہوں۔

اب ہمارے کان کھڑے ہوئے اور ہم نے پوچھا: کیا آپ بتا سکتے ہیں کیوں؟

وہ: وہاں خلافت کانفرنس میں شریک ہونا ہے۔

ہم: جناب کا اسم گرامی!

وہ: فضل الحسن میرا نام ہے۔

میں: (اشتیاق دید کی اضطرابی کیفیت کے ساتھ) ارے تو آپ مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی ہیں!

وہ: اب آپ نے پہچان ہی لیا تو میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔

یہ سن کر ہم سب کو بڑی خوشی ہوئی اور ہم میں سے ہر ایک نے بڑی عقیدت کے ساتھ مولانا سے مصافحہ کیا، اب مولانا نے کہا: آپ بھی تو اپنا تعارف کرائیں، جب مولانا کو علم ہوا کہ ہم سب دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں اور مدرسہ کی جمعیت الطلبا کے عہدہ دار ہیں تو مولانا بڑے مسرور ہوئے اور ہم سے فرداً فرداً دوبارہ مصافحہ کیا، اب ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھے تو میں نے مولانا سے عرض کیا: حضرت! ہم سب آپ کے کلام کے عاشق ہیں، کچھ عطا فرمائیے، مولانا نے فوراً سنانا شروع کر دیا۔ پہلے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے:

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی، مرے دل میں یا دہن میں رہے

اس کے بعد دو تین غزلیں اور سنائیں، مفتی صاحب کہتے تھے: علاوہ شعر و شاعری کے مولانا کی گفتگو بڑی دلچسپ اور پر لطف ہوتی تھی۔

مجھے بڑے بھائیوں کے محلہ میں رہتے ہوئے دو برس ہی ہوئے تھے کہ رمضان کی تعطیل میں آگرہ آیا تو یہاں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم جن کی شفقت توجہ اب میری طرف زیادہ ہوگئی تھی ان کا ایک والا نامہ والد صاحب قبلہ کے نام موصول ہوا جس میں تحریر تھا: "سعید دیوبند کے محلہ بڑے بھائیوں میں رہتا ہے وہاں اس کی صحبت قصبہ کے لڑکوں کے ساتھ رہتی ہے، میں اس کو پسند نہیں کرتا اس لئے اب آپ سعید کو مدرسہ کے احاطہ میں رکھیں" والد صاحب نے جواب دیا: "آپ نے بجا فرمایا میں تعمیل ارشاد کروں گا، مگر درخواست یہ ہے کہ آپ سعید کو ایک کمرہ بلا شرکت غیرے دے دیں اور نیز آپ اس کو براہ راست اپنی یا کسی بڑے استاد کی نگرانی میں رکھ دیں" مہتمم صاحب نے دونوں باتیں مان لیں، چنانچہ مدرسہ یا مسجد کی طرف سے دارالاہتمام میں جانے کے لیے جو زینہ اوپر جا رہا ہے اس کے وسط میں بائیں جانب اس زمانہ میں صرف دو کمرے تھے (اب تیسرا بھی بن گیا ہے) ان میں سے ایک کمرہ جو دروازہ کے سیدھ میں ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد رشیدی رہتے تھے اور دوسرا کمرہ جو اس کی بغل میں ہے اس کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے میرے لیے تجویز فرمایا۔ اس بنا پر رمضان کی تعطیل کے ختم پر میں مدرسہ آیا تو اسی کمرہ میں فروکش ہوا اور رہنے لگا۔

اب میرے قیام دارالعلوم کا تیسرا دور شروع ہوا جو آخری بھی ہے، یہ دور جو تین برس کی مدت پر ممتد ہے، میری تعلیمی زندگی کا نہایت اہم دور ہے، کیونکہ میری تعمیر و تشکیل جو کچھ ہوئی ہے اسی دور میں ہوئی ہے، پہلے میرا ماحول شعری و ادبی تھا، لیکن اب میرا ماحول علمی اور دینی تھا، پہلے میری صحبت چند شہری طلبہ کے ساتھ تھی، اب میں ہر وقت اساتذۂ کرام اور چند نہایت ہونہار اور ذہین و مستعد مختلف صوبوں کے طلبہ کی معیت میں تھا۔ میرا کھانا پینا اور ناشتہ وغیرہ حضرت الاستاذ مولانا

سراج احمد رشیدی کے ساتھ تھا، مولانا جو حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت بھی تھے، دارالعلوم کے اکابر اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اردو اور فارسی کے پختہ کلام شاعر بھی تھے، طبعاً نہایت شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور مجلسی بزرگ تھے، ہر جمعرات کو ان کے ہاں مغرب کے بعد احباب کی مجلس جمتی تھی جو اپنے اپنے گھر سے کھانا لاکر ایک ساتھ ہم طعامی کرتے تھے اور کھانے کے بعد سبز چائے کا دور چلتا تھا جس کا ..... اہتمام مولانا بہت زیادہ کرتے تھے، اس مجلس کے ارکان خاص علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا محمد بدر عالم صاحب میرٹھی۔ مفتی صاحب طباخ بھی بہت اچھے تھے اور خصوصاً مرغ کا اسٹو پکانے میں تو ان کو بڑا کمال تھا۔ اسی لئے اس مجلس میں کبھی کبھی اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز بھی لے کر آتے۔ اسی طرح مولانا محمد بدر عالم صاحب بڑے اچھے شکاری تھے، اس لئے وہ کبھی مرغابی یا تیتر سے اس مجلس کی تواضع کرتے۔

مفتی صاحب اس زمانے میں مدرس تھے اور دارالافتا میں فتویٰ نویسی بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں کرتے تھے، مفتی صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا بڑے شوق، دل کی لگن اور محنت سے پڑھا تھا، پھر ذکاوت و فطانت خداداد اور فطری اور اساتذۂ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار، اس بنا پر ہر علم و فن کی استعداد مفتی صاحب کی پختہ اور اعلیٰ تھی، اس پر مستزاد یہ کہ ان میں ملکۂ تقریر و خطابت اعلیٰ قسم کا تھا، افہام و تفہیم کی صلاحیت قدرتی تھی، اپنے مافی الضمیر کا اظہار بڑی وضاحت اور صفائی سے کرتے جس میں گنجلک یا الجھن نام کو بھی نہ ہوتی تھی، اس بنا پر ان کا درس مقبول تھا، البتہ آواز ان کی بلند تھی اور درس بھی وہ اس بلند آواز سے دیتے تھے کہ ان کی آواز درس گاہ سے باہر دور تک جاتی تھی، مفتی صاحب

کو خود بھی اپنی بلند آوازی پر ہنسی آتی تھی، ایک دن ہنستے ہنستے سنانے لگے: ایک مرتبہ جامع ازہر مصر کے ایک استاد یہاں آئے ہوئے اور دارالعلوم کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، ایک روز وہ درس گاہوں میں گھومتے پھرتے میری درس گاہ میں بھی آگئے، میں اس وقت سلم العلوم (منطق) کا درس دے رہا تھا، میں نے مصری عالم کو خوش آمدید کہہ کر اپنے پاس بٹھالیا اور درس شروع کر دیا اور جب گھنٹہ ختم اور درس ختم ہو گیا تو موصوف مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے: "یا استاذ واللہ انک رجل فاضل، ولکنک تجھر جھیر البری اخاف انک ستکون حمارا" مفتی صاحب یہ واقعہ سنا کر خود بھی ہنس پڑے اور ہم سب کو بھی ہنسی آگئی۔

جہاں تک مفتی صاحب کی فتویٰ نویسی کا تعلق ہے اس کے متعلق وہ خود بیان کرتے تھے کہ شروع شروع میں وہ استفتا کا جواب بہت طویل لکھتے تھے جس میں موافق اور مخالف دلائل اور اخیر میں قول راجح کے دلائل اور ان کی عبارتوں کی بھرمار ہوتی تھی، لیکن حضرت مفتی صاحب ایسے تمام جوابات قلم زد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمہارا جواب ماقل و دل ہونا چاہئے، ہر عبارت نقل کے لائق نہیں ہوتی، پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مستفتی تم سے بحث نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایک مسئلہ کے بارے میں صرف ایک حکم شرعی دریافت کر رہا ہے اس لئے تمہارا مطالعہ تو وسیع اور عمیق ہونا ضروری ہے لیکن جواب مختصر ہونا چاہیئے جس میں صرف چھنی چھنائی بات کا ذکر ہو، مفتی صاحب کہتے تھے: بڑی مشق اور تمرین کے بعد جب مجھ میں یہ صلاحیت اور استعداد پیدا ہو گئی تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: "ہاں اب تم کو فتویٰ لکھنا آگیا۔"

نیشنلزم یعنی قوم پروری اور استخلاص وطن کی تڑپ جیسے مفتی صاحب کی گھٹی میں پڑی تھی، اس معاملہ میں جتنا سنجیدہ فکر اور پختہ خیال میں نے مفتی صاحب

دیا پایاں کے معاصرین میں کسی کو نہیں پایا، ان کی طالب علمی کے زمانہ میں طلبا کا ایک قلمی اخبار نکلتا تھا جس کا نام یاد نہیں رہا، اس اخبار کی ایک اشاعت میں مفتی صاحب کا ایک طویل مضمون "سودیشی کی ضرورت" شائع ہوا تھا، میں نے یہ مضمون از اول تا آخر پڑھا، مضمون نہایت مدلل اور بصیرت افروز، پرزور اور شگفتہ و دلکش زبان میں تھا، میرے دماغ پر مفتی صاحب کے حسن تحریر کا پہلا نقش ان کے اسی مضمون کے مطالعہ سے قائم ہوا تھا، انھوں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا تھا اس کے عملی پیکر وہ خود تھے، چنانچہ اس زمانہ میں بھی جبکہ دارالعلوم کے "شہزادے" یعنی اکابر دیوبند کی اولاد، نہایت عمدہ ململ، چکن کے کرتوں اور چالیس ہزارہ کے لٹھے کے پاجاموں میں ملبوس نظر آتے تھے ــــ مفتی صاحب اس زمانے میں بھی کھدر پہنتے تھے، وضع کے اتنے پابند تھے کہ ایک کرتہ جو زیادہ لانبا نہیں ہوتا تھا بغیر کالر کے ہوتا اور پاجامہ چوڑے پائنچوں کا اور سیدھی کاٹ کا اور دونوں کھدر کے اور کرتہ کے نیچے بنیان وہ بھی کھدر کی عمر بھر ان کا لباس یہی رہا، شیروانی پہنتے تھے مگر وہ بھی دیسی کپڑے کی، اس قسم کے وضعدار خال خال ہی ملیں گے۔

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی میرے ماموں زاد بھائی تھے اور مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے، سیوہارہ کے مدرسہ میں تکمیل تعلیم کے بعد دورۂ حدیث کے لیے دیوبند آئے تھے اور جس سال (۱۳۴۵ھ) میں خود دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اس سال یہ صحیح بخاری کا سماع کر رہے تھے، اس لئے انھوں مجھ سے کہا: تم ہمہ تن متوجہ ہو کر حضرت شاہ صاحب (علامہ محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کی تقریر سنو اور میں تمھارے لئے وہ تقریر لکھتا رہوں گا، چنانچہ انھوں نے دو موٹی موٹی کاپیاں لکھی تھیں، جنھیں میں حرز جاں بنائے رکھتا تھا، لیکن جب ۱۹۴۷ء میں میرا گھر لٹا تو یہ کاپیاں بھی گئیں:

کر دیا سفاک نے میدان صاف

مفتی صاحب کی طرح مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی مشروع سے ہی جذبۂ استخلاص وطن و قوم پروری سے سرشار تھے اور ملکی و قومی مسائل و معاملات میں دونوں کے افکار و نظریات میں بڑی ہم آہنگی و یک جہتی تھی اس پر مستزاد یہ کہ مولانا بڑے فعال و متحرک تھے، ان میں لیڈر بننے کے صفات بدرجہ اتم موجود تھے، ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے، اس وجہ سے اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی مفتی صاحب اور مولانا میں دانت کاٹے کی دوستی تھی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (ثم مہاجر مکی) کو ملکی سیاست اور قومی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اس لیے مفتی صاحب سے خاص تعلق اور ربط رکھتے تھے، اس طرح ہم چار آدمیوں (مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، مولانا بدر عالم اور راقم الحروف) کا ایک گروپ بن گیا تھا جو اوقات مدرسہ کے بعد عموماً ایک ساتھ رہتا تھا۔

ہم چاروں عصر کی نماز اکثر حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ان کی مسجد میں ادا کرتے تھے، اس مسجد میں دو کمرے تھے، ایک اندرون مسجد اور دوسرا بیرون مسجد، پہلا کمرہ حضرت مفتی صاحب کے لئے مخصوص تھا اور دوسرا مفتی صاحب کی نشست گاہ تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد اگر ٹہلنے یا کہیں جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو مغرب تک اسی کمرہ میں نشست رہتی، مسجد میں امامت عموماً تو حضرت مفتی صاحب ہی کرتے تھے، لیکن جہری نمازوں میں کبھی کبھی وہ مفتی صاحب کو آگے بڑھا دیتے تھے، مفتی صاحب حافظ اور ساتھ ہی قاری تو اول درجہ کے تھے ہی ان کی آواز میں لوچ اور ہلکا ہلکا سا درد بھی غضب کا تھا اس لیے نماز میں بڑا لطف آتا تھا، ایک واقعہ سنیے:

۱۹۳۶ء میں ایم اے کا امتحان دلی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس

کرنے کے بعد مفتی صاحب کی دعوت پر جب میں پہلی بار کلکتہ گیا تو ایک روز مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن اور میں، ہم تینوں عصر کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لئے بالی گنج میں ان کی کوٹھی پر گئے۔ مولانا حسب معمول بڑے تپاک اور بے تکلفی سے ملے، باتیں کرتے کرتے مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا تو مولانا کے ملازم احمد نے وہیں ڈرائنگ روم میں جانمازیں بچھا دیں، مولانا اور ہم باوضو تھے ہی، سیدھے مصلّے پر جا کھڑے ہوئے، اب ہم نے مولانا سے امامت کی درخواست کی، لیکن مولانا نہ مانے اور مفتی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا۔ مفتی صاحب نے سورۂ القارعہ اور سورۂ الہٰکم التکاثر اپنے لحن داؤدی میں تلاوت کیں، سلام پھیرنے کے بعد مولانا آزاد نے دو رکعتیں سنت کی ادا کیں مگر کمال خشوع وخضوع سے، اس کے بعد صوفہ پر بیٹھ گئے، آنکھیں بند کرلیں، ایک اونی چادر جو اوڑھے تھے اس سے اپنے تمام جسم اور آنکھوں کو مستغنی کر کے تمام سر اور چہرہ چھپا لیا۔ دس منٹ کے بعد جب آنکھیں کھولیں تو مفتی صاحب کو خطاب کر کے فرمایا: "مولوی صاحب! اگر اصول تجوید کی رعایت کے ساتھ حسن صوت نہ ہو تو مخارج صحیح ادا ہوں گے مگر دل پر اثر نہ ہوگا، اللہ جل شانہٗ کا آپ پر بڑا فضل وکرم ہے کہ تجوید کے ساتھ خوش آوازی کی نعمت سے بھی آپ بہرہ ور ہیں۔ اس لیے آپ کی قرارت دل کے دروازہ پر دستک دیتی ہے۔"

ایک مرتبہ اس مسجد میں بڑا عجیب وغریب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ ہم چاروں نے حسب معمول عصر کی نماز مسجد میں حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ادا کی، ایک بنگالی طالب علم تھا وہ بھی کم از کم عصر کی نماز تو اسی مسجد میں پڑھتا تھا، آج اس نے یہ کیا کہ نماز کا سلام پھرتے ہی کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا: "حضرات! اب میں دیوبند سے جا رہا ہوں، آپ میرے لیے دعا کریں کہ میرا خاتمہ بخیر اور اسلام پر ہو" جب دعا ختم ہوگئی تو حضرت مفتی صاحب اس طالب علم کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: "تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے

کہا: "تھانہ بھون" کیوں؟ حضرت مفتی صاحب نے دریافت فرمایا، "حضرت تھانوی مظلہ العالی سے تصوف کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے" طالب علم نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت مفتی صاحب کو غصہ آگیا اور سخت لہجہ میں فرمایا: مولانا اشرف کو صوفی کون کہتا ہے، انھیں تصوف سے کیا واسطہ! حضرت مفتی صاحب کے یہ الفاظ بہ ظاہر بہت سخت اور حیرت انگیز ہیں، لیکن ان کی وضاحت واقعہ ذیل سے ہوگی:

اس واقعہ کے چھ سات برس کے بعد جب میں مدرسہ عالیہ مسجد فتحپوری دہلی میں تھا، ایک روز میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ باتوں باتوں میں حضرت تھانوی کا ذکر نکل آیا تو میں نے یہ واقعہ سنایا، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اسے سنتے ہی ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے اور گردن جھکا تھوڑی دیر کے بعد گردن اٹھائی، ..... اور تاثراتی لہجہ میں فرمایا: "میاں سعید! کیا یہ واقعہ سچا اور تمہارا عینی مشاہدہ ہے؟" میں نے عرض کیا: جی ہاں! اس وقت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی موجود تھے، یہ دونوں حضرات تو یہیں دلی میں موجود ہیں، آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں" یہ سن کر فرمایا: اگر یہ واقعہ صحیح ہے ـــــ اور جب تم کہہ رہے ہو تو یقیناً صحیح ہی ہے ـــــ تو آج میرے دل کی ایک پرانی گرہ کھل گئی اور اس کی تفصیل یہ ہے: تحریک خلافت اور اس کے ضمن میں تحریک ترک موالات بڑے زوروں پر تھی اور جمعیت علمائے ہند کے زیر قیادت بڑی کامیابی سے چل رہی تھی، لیکن مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اس تحریک میں نہ صرف یہ کہ شریک نہیں ہوئے، بلکہ اس کی مخالفت میں فتویٰ دیا۔ جمعیت علمائے ہند نے اس کا سخت نوٹس لیا اور طے کیا کہ جمعیت کا ایک سہ نفری وفد تھانہ بھون پہونچ کر براہ راست مولانا سے گفتگو کرے، اس وفد کے لیے

تین نام منظور ہوئے : (۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (۲) مولانا احمد سعید دہلوی اور (۳) میں (حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ) ہم تینوں تھانہ بھون پہونچے اور تین روز تک وہاں مقیم رہے، مولانا سے ہم لوگوں کی گفتگوؤں کا جو حشر ہوا وہ تو سب کو معلوم ہے، دراصل سنانا یہ ہے کہ ایک دن ہم مولانا کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا، مولانا تھانوی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: حضرت! میں مظاہر العلوم کا ایک طالب علم ہوں، حضرت سے استفادۂ باطنی کی غرض سے حاضر ہوا ہوں، مولانا نے پوچھا کیا تم نے پہلے سے خط کے ذریعہ اس کی اجازت لی ہے، یہ شخص بولا: جی نہیں، اس پر مولانا نے برہم ہو کر کہا کہ تم اٹھ جاؤ، مگر وہ نہیں اٹھا، مولانا نے پھر کہا جاؤ مگر وہ پھر بھی بیٹھا رہا، اس پر مولانا کے پاس ایک رسّی کا بنا ہوا سونٹا رکھا رہتا تھا اس سے مولانا نے اس کو مارنا شروع کیا مگر یہ شخص اتنا ڈھیٹ تھا کہ پٹتا رہا مگر مجلس سے نہیں اٹھا، مولانا نے اس کو اتنا مارا کہ ہم سب کو رحم آگیا۔ اس وقت میرے دل نے کہا کہ مولانا تھانوی سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن صوفی نہیں ہو سکتے۔

اس واقعے کو سنانے کے بعد مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میری دل کی آواز عجیب و غریب تھی اس لیے میں نے اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا اور اپنا احساس اپنے ہی تک محدود رکھا لیکن اب تم نے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا واقعہ جو سنایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس احساس میں تنہا میں ہی نہیں ہوں بلکہ حضرت مفتی صاحب بھی اس میں شریک ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کرام خلق خدا کے لیے سراپا رحم و کرم اور مجسمہ شفقت و محبت ہوتے تھے، ان کی خانقاہوں کا دروازہ ہر وقت ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا، ان کے یہاں آنے جانے والوں پر کسی قسم کی کوئی پکڑ دھکڑ یا داروگیر کا

ضابطہ نہیں تھا، اس کے برخلاف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مسترشدین کے لیے خاص خاص شرائط اور ضوابط تھے اور جو کوئی شخص ان شرائط وضوابط میں سے کسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتا تھا وہ مورد عتاب بنتا تھا، اس فرق کی بنا پر سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر خانقاہی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت تھانوی نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ میں نہ صوفی ہوں نہ پیر بلکہ میں ایک معلم اور مصلح ہوں، جو شخص میرے پاس آتا ہے میں اس کے لیے اصلاح وتربیت کا کام کرتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیت معلم ومصلح اصلاح نفس، اصلاح عقائد، اصلاح معاملات ورسوم اور اصلاح عبادات واخلاق کے سلسلے میں جو نہایت عظیم الشان علمی اور عملی کارنامے انجام دئے ہیں ان کے پیش نظر ان کو اس صدی کا مجدد بے تکلف کہا جا سکتا ہے اس بنا پر حضرت مفتی عزیز الرحمن اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کو صرف ایک لفظی اصطلاح کا فرق سمجھنا چاہیئے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں ان کے کردار اور معیار کے مطابق نمبر جلد شائع ہونے جا رہا ہے۔ ایڈیٹر صاحب برہان کی طویل علالت کی وجہ سے اس میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہے۔ آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے سلسلے میں مضامین بلا تاخیر بھیجئے اور مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایڈیٹر رسالہ برہان کے لئے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

مینیجر رسالہ برہان
عبید الرحمن عثمانی